پاکستان کے سیاسی و معاشرتی نظام میں

اسلامی قانون کا منصب و مقام

(جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس، سابق جج سپریم کورٹ پاکستان)

(۲)

چوری کی اسلامی سزا اب قطعِ ید کی بحث شروع کرتے ہوئے سب سے پہلے میں اس امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہاتھ کاٹنا جرمِ سرقہ[1] کی انتہائی سزا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ بعض مفسرین چوری کے معمولی واقعات پر یہ سزا دینا صحیح نہیں سمجھتے اور صرف پکے مجرموں پر ہی اس حکم کا اطلاق کرتے ہیں کیونکہ ان کی رائے میں السارق اور السارقہ کے الفاظ پر الف لام کا لایا جانا یہ اشارہ کر رہا ہے کہ اس سے مراد چوروں کی ایک خاص قسم ہے۔ تاہم جو صورت بھی ہو، یہ بات تو مسلّم ہی ہے کہ قطعِ ید سرقہ کی انتہائی سزا ہے۔ اگر چوری کا مال نصاب سے کم ہو تو اس پر یہ سزا نہ دی جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے فیصلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر بھوک مٹانے کے لیے باغ کا پھل توڑ کر کھا لیا جائے تو اس پر بھی سرقے کی حد جاری نہ کی جائے گی۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانے میں اس حد کو ساقط کر دیا تھا۔ ڈاکہ زنی کے لیے قرآن مجید میں جو سزائیں تجویز کی گئی ہیں ان میں ایک سزا قید بھی ہے اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ چوری کے لیے قطعِ ید سے کمتر کوئی سزا ہی نہ ہو۔

---

[1] سرقہ اپنے لغوی معنی میں تو مطلقاً ہر چوری کو کہیں گے لیکن اصطلاحِ شریعت میں اس سے مراد ہے کسی غیر کے مال کو کسی خاص جگہ سے کسی خاص مقدار میں چرا کر لینا۔ السرقۃ اخذ مالیس لہ اخذہ فی خفاء وصار ذالک فی الشرع لتناول الشیٔ من موضع مخصوص وقدر مخصوص۔ یعنی "سرقہ کے اصل معنی تو خفیہ طور پر کوئی ایسی چیز لے لینے کے ہیں جس کے لینے کا حق آدمی کو نہ ہو۔ اور اصطلاحِ شریعت میں کسی چیز کو مخصوص جگہ سے

دوسری قابلِ ذکر چیز یہ ہے کہ شریعت نے جو سزائیں تجویز کی ہیں وہ صرف اُس صورت میں قابلِ نفاذ ہیں جبکہ ایک صحیح اسلامی ریاست موجود ہو۔ یہ سزائیں دراصل ایک نظامِ حیات کا جُز ہیں۔ اگر اُس نظام سے الگ کر کے اُن کو نافذ کیا جائے تو یہ سراسر نامناسب بھی ہو سکتی ہیں۔ اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریات یعنی خوراک، تن ڈھانکنے کے لیے لباس، رہنے کے لیے ایک جگہ، بچّوں کے لیے تعلیم کی ذمّہ دار ہے۔ اُس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایک بیت المال قائم کرے جس سے غریب لوگوں کی حاجات پُوری کی جائیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ "زکوٰۃ مالداروں سے لی جائے گی اور محتاجوں کو دی جائے گی"۔ ایک حدیث کی رُو سے حکومت لوگوں کی "ولی" ہے اور ایک دوسری حدیث کی رُو سے جس شخص پر کچھ ذمہ داریوں کا بوجھ ہو اور وہ مر جائے تو اس کا بار حکومت پر عائد ہوتا ہے۔ مزید برآں اسلامی ریاست اپنے شہریوں کے لیے صرف معاشی ضروریات ہی کی کفالت نہیں کرتی بلکہ اُن کی اخلاقی اصلاح اور اُن میں صحیح اسلامی رُوح پیدا کرنے کا بھی التزام کرتی ہے جس کا اساسی تصوّر یہ ہے کہ جینا اور مرنا خدا کے لیے ہے نہ کہ اپنی ذات کے لیے۔ دنیا کی موجودہ زندگی آخرت کی زندگی کے لیے ایک تیاری ہے اور اصل زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے، اور یہ کہ دنیا میں جو چیز اصل اہمیت رکھتی ہے وہ ہمارے کردار کی بھلائی اور بُرائی ہے۔ پھر ایک اسلامی ریاست میں نماز اور روزہ کی پابندی لازمی ہوتی ہے جس سے عذرِ شرعی کے بغیر کوئی مستثنیٰ نہیں ہوتا۔ اُس میں جُوا اور شراب نوشی جُرم قرار پاتے ہیں۔ سُود خوری کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے اور اگرچہ قانون یہ نہیں ہے، لیکن تمام مسلمانوں کے لیے اسلام کا رہنما اصول یہی ہے کہ ہر شخص اپنی دولت سے اپنی معقول ضروریات پوری کرے اور جو کچھ بچے اسے معاشرے کی بھلائی پر خرچ کر دے۔

اب اگر کوئی کہے کہ اس نوعیت کے اسلامی نظامِ زندگی میں بھی، اور انتہائی سزا کی حیثیت بھی،

م۔ مخصوص مقدار میں لے لینے کے ہیں" (مفردات امام راغب)، علاوہ بریں فقہ اسلامی میں چوری کے لیے بہت سی شرائط مقرر کی گئی ہیں جو اگر نہ پائی جائیں تو سرقہ مستوجب حد کا اس پر اطلاق نہ ہوگا اور سارق کو قطعِ ید کے سوا کوئی اور سزا دی جائے گی۔ (مترجم)

ہاتھ کاٹنے کی یہ سزا خلافِ انسانیت ہے، تو میں اس قول کو چیلنج کروں گا۔ میں یہ بات تو تسلیم کرتا ہوں کہ جس معاشرے میں یہ حد جاری کی جا رہی ہو اُس کے افراد کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کو ہمیں ضرور نگاہ میں رکھنا چاہیے اور اگر اس سے کم تر کوئی سزا دے کر لوگوں کو چوری سے باز رکھنا ممکن ہو تو انتہائی سزا دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن میں یہ ماننے سے قطعی انکار کرتا ہوں کہ یہ سزا کسی معاشرے میں کسی فرد کے لیے بھی مناسب نہیں اور اسے قانون میں سرے سے درج ہی نہ کیا جائے۔ اصولاً اس سزا پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک مناسب ہونے کا سوال ہے، کسی سزا کے معاملہ میں اُس کا فیصلہ کرنے کے لیے معیار یہ ہے کہ آیا وہ سزا معاشرے کی بھلائی کی موجب ہو گی؟ بھلائی کا تعین کرنے میں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ مجرم پر کیا گزرے گی اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ معاشرے پر کیا گزرے گی۔ سزا کے تعین میں نہایت اہم قابلِ لحاظ پہلو اس کا عبرتناک ہونا ہے، چنانچہ موجودہ فلسفۂ قانون تک میں یہ اصول تسلیم کیا جاتا ہے کہ نہایت سخت سزا بھی مبنی بر انصاف ہے اگر وہ مجرمین کے لیے عبرت انگیز ہو اور اس کا اثر یہ ہو کہ لوگ جرائم سے باز رہیں۔ میں یہاں سالمنڈ (SALMOND) کی "اصول قانون" سے، جو تحلیلی فلسفۂ قانون پر ایک مستند کتاب مانی جاتی ہے، ایک اقتباس نقل کرتا ہوں۔ اس میں فاضل قانون دان نے بتایا ہے کہ کسی مجرم کو زندہ جلا دینا تک مبنی بر انصاف ہے، اگر اس سزا سے مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے لوگوں کو ارتکابِ جرم سے باز رکھا جا سکتا ہو، بلا لحاظ اس کے کہ جرم سنگین ہو یا معمولی۔ مصنف کے الفاظ یہ ہیں

"جرم کی ذمہ داری مشخص کرنے میں قانونِ فوجداری کے اِس مقصد کی طرف خاص توجہ کرنی چاہیے کہ وہ جرائم کا سدباب کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بات بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ اس پہلو سے غور و فکر کے جو نتائج برآمد ہوں وہ سزا کے اُن تبعی اور ضمنی مقاصد کا لحاظ کرتے ہوئے قابلِ ترمیم ہوتے ہیں جنہیں اس غور و فکر میں ہم وقتی طور پر نظر انداز کر جاتے ہیں"

"اگر تمام انسان اتنے عقلمند ہوتے کہ وہ ہمیشہ یکساں طریقے سے نتائج کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر کے کام کرتے تو سزا کی مقدار متعین کرنے کا مسئلہ کوئی دشواری پیدا نہ کرتا۔ سیدھے سادے طریقے سب کے ساتھ ایک ہی طرح کی سختی بجا بھی ہوتی اور مؤثر بھی۔ اس صورت میں یہ وقتی

مفروضہ کہ تمام جرائم جرم میں یکساں ہیں قابلِ عمل ہوتا اور ایک مقرر طریقہ سے ہٹ کر جو فعل بھی کیا جاتا، خواہ وہ کتنا ہی ہلکا ہو، اس پر سخت ترین سزا دے ڈالی جاتی۔ اس بات کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگر قانون کی سخت گیری کے ترہیبی نتائج و اثرات بالکل یقینی اور ہمہ گیر ہوتے تو ان حالات میں بہترین قانون وہ ہوتا جو انتہائی اور بلا امتیاز سختی سے جرائم کا خاتمہ کر دیتا۔ اگر انسانی فطرت ایسی ہوتی کہ تمام مجرموں کو آگ میں جلا دینے کی دھمکی حتمی طور پر ہر قسم کی قانون شکنی کو روک دیتی تو پھر بغاوت سے لے کر معمولی چوری تک تمام جرائم کے لیے یہی سزا بالکل مناسب اور مبنی بر انصاف ہوتی۔"

آگے چل کر یہ مصنف اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ انسانی فطرت جیسی کہ وہ ہے، اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ سب لوگ اِس سنگین سزا سے ڈر کر ارتکابِ جرم سے باز رہیں گے۔ اس بنا پر انسانیت کے لیے یہ سزا (یعنی مجرم کو زندہ آگ میں جلا دینا) مفید نہیں ہے۔ لیکن اس معاملہ میں اصل توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ کسی سزا کے مناسب یا نامناسب ہونے کا فیصلہ کرنے میں سب سے زیادہ اہمیت اس سوال کو حاصل ہے کہ وہ کس حد تک جرائم کو روکنے کی تاثیر رکھتی ہے۔ اگر یہ بات اصولِ عامہ کی حیثیت رکھتی ہے تو ایک اسلامی ریاست میں اس کا وزن اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے، کیونکہ انسانی زندگی کی پاکیزگی کو اُس میں فیصلہ کُن اہمیت حاصل ہے۔

میں متعدد دوسری کتابوں کے حوالے بھی دے سکتا ہوں جن میں سنگین سزاؤں کو جائز قرار دیا گیا ہے، لیکن میں یہ اس لیے نہیں کرتا کہ اس مسئلے کا فیصلہ ماہرین کی آراء کے بجائے اصول کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ سزاؤں کی سنگینی پر اعتراض کی اصل وجہ سزا کی روحانی نوعیت کو نہ سمجھنا ہے۔ سزا دراصل ایک ظلم نہیں ہے جو ایک شخص دوسرے شخص پر کرتا ہے، بلکہ وہ ایک قربانی ہے جو معاشرہ اپنی اخلاقی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کے لیے دیتا ہے، اور کم از کم مسلم معاشرے کے معاملے میں تو وہ ایک کفارہ بھی ہے۔ یہ دونوں ہی چیزیں (یعنی قربانی اور کفارہ) بلند ترین اخلاقی قدر و قیمت کی حامل ہیں۔ جب ایک معاشرہ کسی سزا کا قانون بناتا ہے تو درحقیقت وہ انسانیت کی بھلائی کے لیے ایک نقصان برداشت کرنے کے لیے

تیار ہو جاتا ہے۔ ہم یہاں اُن سزاؤں سے بحث نہیں کر رہے ہیں جو جابر فرمانروا اپنی رعایا کی مرضی کے خلاف اُن کے لیے مقرر کرتے ہیں۔ یہاں صرف وہ سزائیں زیر بحث ہیں جو ایک معاشرہ اپنی فلاح کے لیے خود اپنے اوپر نافذ کرتا ہے۔ کوئی دوسرا اُس معاشرے پر اُنہیں مسلط نہیں کرتا، بلکہ وہ خود اعلیٰ اور ارفع انسانی مقاصد کی خاطر اپنی مرضی سے اپنے اوپر انہیں عائد کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ کوئی ایسا معاشرہ جو ایثار و قربانی کے لیے تیار نہ ہو اپنے اوپر سخت سزائیں عائد نہیں کر سکتا۔

ایک سچے مسلم معاشرے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اندر قانون کی اطاعت کا جذبہ رکھتا ہے۔ ہمارا فطری شاعر اقبال کہتا ہے:

ہستیٔ مسلم ز آئین است و بس

باطنِ دین نبی این است و بس

تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ مجرم خود چل کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور خود اپنے اوپر انتہائی سخت سزائیں نافذ کرنے کا انہوں نے باصرار مطالبہ کیا جن میں سزائے موت تک شامل تھی، حالانکہ کسی نے ان پر جرم کا الزام عائد نہ کیا تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوشش کرتے رہے کہ ان کے اعترافِ جرم کی سماعت نہ فرمائیں۔ ہمارے سامنے یہ مثال بھی موجود ہے کہ خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ سے جب ایک عورت نے شکایت کی کہ اُن کے بیٹے نے چند مہینے پہلے اس کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کیا ہے تو انہوں نے اپنے سامنے اپنے بیٹے کو سزائے تازیانہ دلوائی جس سے وہ مر گیا۔ پھر وہ رو پڑے اور لوگوں سے کہا کہ گواہ رہو، میں نے اپنے خدا اور رسول کے حکم کی تعمیل کر دی ہے۔ اسلام کے سوا انسانی تاریخ میں کہیں ایسی پُرجوش اطاعت قانون کی مثالیں نہیں ملتیں۔

قطعِ ید کی سزا لوگوں کو جرم سے باز رکھنے میں کس حد تک موثر ثابت ہو سکتی ہے اس کا اندازہ سعودی عرب کے حالات سے لگایا جا سکتا ہے جہاں یہ سزا نافذ ہے۔ یہ ایک نہایت مشہور و معروف بات ہے کہ وہاں آپ اپنا گھر کھلا چھوڑ کر کئی کئی دن کے لیے باہر جا سکتے ہیں، اور دن میں کئی کئی بار اپنی دوکان، حتیٰ کہ جواہر اور زیورات تک کی دوکان کھلی چھوڑ کر نماز کے لیے جا سکتے ہیں، چوری کا

کوئی خطرہ آپ کو نہ ہوگا۔[1]

قطعِ ید کی سزا پر جو لوگ معترض ہیں ان میں کچھ نہ کچھ ایسے اصحاب بھی ضرور ہونگے جو الہامی مذاہب کے ماننے والے ہیں۔ ان سے میں کہوں گا کہ اگر یہ سزا وحشیانہ ہے تو آپ خدا اور اس کے رسولوں پر وحشت کا الزام عائد کرتے ہیں۔ بائیبل کے عہد نامہ قدیم میں جو سزائیں تجویز کی گئی ہیں، اور عہد نامہ جدید میں جنہیں منسوخ نہیں کیا گیا ہے انہیں اگر اُسی معیار پر آپ جانچیں جس پر آپ قطعِ ید کی سزا کو جانچتے ہیں، تو ان کو اس سے زیادہ وحشیانہ کہا جا سکتا ہے۔ عہد نامہ قدیم کی رُو سے بارہ جرائم ایسے ہیں جن کی سزا رجم (سنگساری) ہے۔ ان جرائم میں سبت کے احکام کی خلاف ورزی، بے عصمتی (زنا نہیں)، کفر بکنا، ماں باپ پر دست درازی یا ان پر لعنت کرنا، نبوت کا جھوٹا دعویٰ، جادوگری، بُت پرستی، اور جھوٹی شہادت شامل ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے پہلے ہر قسم کی زنا کاری کے لیے ایک ہی سزا تھی اور وہ یہ کہ مجرم کو زندہ جلا دیا جائے۔ عہد نامہ قدیم میں یہ سزا صرف کاہن (برہمن) کی بیٹی کے لیے مخصوص کر دی گئی۔ بعض جرائم کی سزا تلوار یا نیزے سے قتل کرنا بھی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے آکر ان سزاؤں کو منسوخ نہیں کیا، بلکہ یہ فرمایا کہ:

"یہ نہ سمجھو کہ مَیں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پُورا کرنے آیا ہوں کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے"۔ (متی باب ۵ - آیات ۱۷-۱۸)

میں یہاں وہ قانون بھی نقل کرتا ہوں جو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے خود بیان فرمایا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

---

[1] ابھی فروری ۱۹۶۸ء کے ریڈرز ڈائجسٹ میں گارڈن گاسکل کا ایک مضمون شاہ فیصل کے بارے میں نکلا ہے جس میں مضمون نگار چوری کی سزا کے متعلق لکھتا ہے کہ "بیرونی ممالک سے آنے والے لوگ اس سزا کو سخت ہولناک سمجھتے ہیں مگر انہیں بھی یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان سزاؤں نے سعودی عرب کو دنیا میں سب سے زیادہ جرائم سے پاک ملک بنا دیا ہے"۔ (مترجم)

"پس اگر تیری دہنی آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اُسے نکال کر اپنے پاس سے پھینک دے کیونکہ تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ تیرے اعضاء میں سے ایک جاتا رہے اور تیرا سارا بدن جہنم میں نہ ڈالا جائے۔ اور اگر تیرا داہنا ہاتھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اس کو کاٹ کر اپنے پاس سے پھینک دے، کیونکہ تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ تیرے اعضا میں سے ایک جاتا رہے اور تیرا سارا بدن جہنم میں نہ جائے۔" (متی باب ۵۔ آیات ۲۹-۳۰)

بائیبل کے اس اقتباس سے یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ مجرم آنکھ یا مجرم ہاتھ کو جسم سے کاٹ کر الگ کر دیا جائے اور یہ مطلب بھی اس کا ہو سکتا ہے کہ معاشرے کے مجرم افراد کو موت کی سزا دی جائے۔ دونوں صورتوں میں یہ ایک سنگین سزا ہے۔ اب اگر عہد نامۂ جدید کو خدا کا آخری حکم مانا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ قانون اِس وقت تک قائم ہے۔ لیکن ہم مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان قوانین کو منسوخ کر کے قرآن کا قانون ہمیں دیا گیا ہے جو نوعِ انسانی کے لیے خدا کا آخری پیغام ہے اور جو انسانی تاریخ کے اُس دور میں نازل کیا گیا ہے جبکہ انسانیت اپنے ارتقاء کے اُس مرحلے پر پہنچ چکی تھی جس میں اس کو خدا کا آخری فرمان اور مکمل ہدایت نامہ دینا موزوں تھا۔ بائیبل میں جو احکام دیئے گئے تھے وہ اُسی زمانے کے لیے تھے جس میں وہ نازل ہوئے۔ اب وہ قرآن سے منسوخ ہو چکے ہیں۔

جو لوگ الہامی مذہب کے قائل نہیں ہیں ان سے میں کہتا ہوں کہ اگرچہ آپ انبیاء علیہم السلام کی نبوت اور رسالت کو نہیں مانتے لیکن اس امر سے تو آپ انکار نہیں کر سکتے کہ یہ لوگ اپنے کردار میں نہایت راستباز تھے، انسانیت کے سچے بہی خواہ تھے، اور اپنے وقت کے بہترین اخلاقی رہنما تھے۔ ان پیغمبروں نے ان سزاؤں کو خلافِ انسانیت نہیں سمجھا۔ کیا اب ہمارے لیے یہ درست ہو گا کہ ہم پیغمبروں کے ضمیر اور خاص طور پر عیسیٰ مسیح جیسے حلیم اور رحم دل انسان کے ضمیر کا فیصلہ رد کر کے ان لوگوں کا فیصلہ قبول کر لیں جو موجودہ تہذیب کی پیداوار ہیں؟ اُس تہذیب کی پیداوار جس میں بین الاقوامی معاملات کا طریقِ کار اخلاق سے ناآشنا ہے، جس میں افراد کے لیے گناہ اور روایتی اخلاقیات کا تصور بالکل بے معنی ہو چکا ہے، جس میں زنا اور "صحبتِ ہم جنس" کو ناقابلِ اعتراض سمجھا جاتا ہے، اور جس میں

مادی منافع کا حصول ہی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔

ایک مادہ پرستانہ نظریۂ حیات لازماً انسان کے معیارِ حق و باطل کو متاثر کرتا ہے۔ لذت و مسرت کے پیچھے بے تحاشا دوڑنے سے انسانی روح کمزور ہو جاتی ہے۔ کسی سزا کے سخت ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ زیادہ تر تین بنیادوں پر کیا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ ایک مجرمانہ فعل کس قدر غضب کا موجب ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے اعادہ کو روکنا کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ جو سوسائٹی کسی قانونی تعزیرات کو نافذ کر رہی ہے اس کے افراد بالعموم کتنی سزا برداشت کر سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں یہ تینوں عوامل برسرِ انحطاط ہیں۔ گناہوں کا ارتکاب زیادہ سے زیادہ ہو رہا ہے۔ معاشرے کو پاک رکھنے کی اہمیت روز بروز گھٹ رہی ہے اور برداشت کی قوت اس سے بہت کم ہے جتنی پہلے تھی۔ میں اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ بائیبل کی سزائیں انسانی ارتقاء کے ایک خاص دور کے لیے مقرر کی گئی تھیں اور قرآن کی مقرر کردہ سزاؤں سے وہ بہت زیادہ سخت تھیں۔ لیکن اگر وہ سزائیں اُس زمانے میں مبنی بر انصاف تھیں تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اِس زمانے کے لیے قرآنی سزائیں مبنی بر انصاف ہیں۔ موجودہ تہذیب کے نمائندوں کی نگاہ میں افعال کے جرم ہونے یا نہ ہونے کا جو معیار ہے اسے مان لیا جائے تو ہمیں زنا اور صحبتِ ہم جنس کو سرے سے جرائم کی فہرست ہی سے خارج کر دینا ہوگا اور سزائے موت کو قطعی منسوخ کر دینا پڑے گا۔

اسلامی قانون کی مقرر کردہ سزاؤں کے بارے میں خلافِ انسانیت ہونے کے الزام پر بحث کرتے ہوئے مناسب ہوگا کہ ہم اُن کا مقابلہ اُن سزاؤں سے بھی کر کے دیکھیں جو مغربی ممالک میں انیسویں صدی کی ابتدا تک رائج تھیں۔ اسلامی قانون کی سزائیں ساتویں صدی عیسوی میں مقرر ہوئی تھیں، اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، ان میں سزائے موت صرف قتل اور ڈاکہ زنی کے جرائم پر ہے، یا پھر زنا بعد احصان پر جس کے بارے میں اختلافِ رائے ہے[1]۔ مگر مغربی ممالک میں کیا سزائیں

[1] واضح رہے کہ اسلام میں قتل قابلِ راضی نامہ جرم ہے، اور سزائے موت صرف اس صورت میں دی جاتی ہے جبکہ مقتول کے ورثاء اس کا مطالبہ کریں۔ ڈاکہ زنی کے لیے سورۂ مائدہ آیت ۳۳ میں چار سزائیں تجویز کی گئی ہیں

مقرر تھیں؟ مثال کے طور پر ان میں سے صرف ایک ملک انگلستان کو لے لیجیے۔ انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے تک ۲۲۳ جرائم ایسے تھے جن کی سزا موت تھی۔ ان میں چند جرائم یہ تھے۔ چوری جبکہ ایک شلنگ سے زیادہ کا مال چرایا گیا ہو۔ دنگہ فساد۔ بینکوں یا پلوں یا سیلاب روکنے والے دروازوں کو برباد کرنا۔ نظامِ عدالت کے خلاف جرائم۔ صحت عامہ کے خلاف جرائم۔ نظام مالگزاری کے خلاف جرائم۔ زنا بالجبر، جبری اغوا اور دوسرے جنسی جرائم۔ اور جہاں تک غداری و بغاوت کا تعلق ہے، اس کی سزا تو ایسے طریقہ سے دی جاتی تھی کہ قابلِ بیان نہیں ہے۔ حتیٰ کہ آج بھی اس جرم پر (جیسا کہ ہالسبری کے دوسرے ایڈیشن سے معلوم ہوتا ہے) فرمانروا یہ حکم دے سکتا ہے کہ مجرم کا سر ایسی حالت میں کاٹا جائے جبکہ وہ ابھی زندہ ہو۔ اس طرح یہ بات دیکھی جا سکتی ہے کہ سزاؤں کی سختی کے معاملہ میں اسلامی قانون کا اُن قوانین سے کوئی مقابلہ نہیں ہے جو انیسویں صدی کے ابتدائی دور تک انگلستان میں رائج تھے۔ اور خود اس زمانے میں بھی دنیا کے متعدد ممالک ایسے ہیں جن کی سزائیں شریعت سے زیادہ سخت ہیں۔ مثال کے طور پر سوویٹ روس میں بعض قسم کی چوریوں کے لیے، رشوت خوری کے لیے، زنا بالجبر کی بعض شدید صورتوں کے لیے، اور جعلی سکہ سازی بطور ایک پیشے کے اختیار کرنے والوں کے لیے گولی مار کر ہلاک کرنے کی سزا ہے۔

سطور بالا میں میں نے مختصراً اُس تغیر کا ایک نقشہ پیش کیا ہے جو اسلامی قانون کے نفاذ سے رونما ہوگا۔ لیکن اصل تغیر زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر کا تغیر ہے۔ اور یہی حقیقی اہمیت کا تغیر ہے۔

۴۔ اور ڈاکو کے لیے سزائے موت صرف اس صورت میں ہے جبکہ اس نے محض لوٹنے پر اکتفا نہ کیا ہو بلکہ جان بھی لی ہو۔ رہی زنا بعد احصان کی سزا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس پر رجم کا حکم دیا ہے اور خلفائے راشدین کے پورے عہد میں اسی پر عمل ہوتا رہا ہے۔ فقہائے اہلِ سنت اس پر متفق ہیں اور صرف خوارج نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ (مترجم)

اِستدراک

از ایڈیٹر

فاضل مقالہ نگار نے اسلامی تعزیرات کے خلاف مغربی نقطۂ نظر پر جو تنقید کی ہے، اس پر ہم مزید دو نکات کا اضافہ کریں گے۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ دورِ جدید میں اہلِ مغرب کی رائے عام کو (جو اُن کے ہاں قانون کا اصل سرچشمہ ہے) اور ان کے قانون سازوں اور ان کی عدالتوں کو اِس تخیل نے بہت متاثر کیا ہے کہ جُرم دراصل ایک ارادی عمل نہیں ہے بلکہ مجرم کی ذہنی بیماری کا نتیجہ ہے جس پر سزا دینے کے بجائے ہمدردی کے ساتھ اس کا علاج ہونا چاہیے۔ یہ تاثر اگرچہ ابھی تک اس حد کو نہیں پہنچا ہے کہ وہاں جیلوں کی جگہ ذہنی امراض کے شفاخانے لے لیں، لیکن اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا ہے کہ اخلاقی جرائم کے معاملہ میں قانون کا رویہ روز بروز نرم ہوتا چلا جا رہا ہے اور مغربی ممالک میں جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار بڑی حد تک اِسی نرم رویّہ کی رہینِ منّت ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس نظریے کے دلائل میں کیا وزن ہے اور کیا نہیں ہے، ایک شخص جب عملاً یہ دیکھتا ہے کہ جہاں جرائم کے متعلق یہ نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے وہاں تو وہ خوفناک رفتار سے بڑھ رہے ہیں، اور جہاں اسلامی تعزیرات نافذ ہیں وہاں وہ بالکل مفقود ہونے کے قریب پہنچ گئے ہیں، تو وہ یہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آخر یہ کیسی "ذہنی بیماری" ہے جو مغرب میں بڑھ رہی ہے اور سعودی عرب میں گھٹ رہی ہے؟ اگر جرم واقعی کسی بیماری کا نتیجہ ہے، اور سزا اس کا کوئی علاج نہیں ہے تو سعودی عرب میں بھی اس مرض کے مریض اُسی رفتار سے پیدا ہونے چاہییں جس رفتار سے مغربی ممالک میں پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن جب ہم علانیہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہاں ان کی پیدائش قریب قریب بند ہو گئی ہے تو اس کے معنی لازماً یہ ہیں کہ اس مرض کے علاج کا بہترین طریقہ وہ نہیں ہے جو اہلِ مغرب تجویز کر رہے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ قاتلوں سے برسرِ عام قصاص لیا جائے، چوروں کے ہاتھ مجمعِ عام میں کاٹے جائیں، اور زانیوں پر پبلک کی

نگاہوں کے سامنے کوڑے برسائے جائیں۔ اس طریقہ سے اُن بہت سے اذہان کا نفسیاتی آپریشن ہو جاتا ہے جن کے اندر جرم کی بیماری موجود ہوتی ہے، اور وہ غدود خشک ہو جاتے ہیں جن سے مجرمانہ رجحانات ابھارنے والی رطوبتوں کی تراوش ہوا کرتی ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں مغربی ممالک کے عوام و خواص اور ان کے قانون سازادارے اور عدالتوں کی ہمدردیاں اب اُس معاشرے کے لیے نہیں ہیں جسے مجرموں کے جرائم سے بے شمار نقصانات پہنچتے ہیں، اور اُن مظلوموں کے لیے بھی نہیں ہیں جو ان کی زیادتیوں کے شکار ہوتے ہیں، بلکہ اُن مجرموں کے لیے ہیں جنہیں سزا دی جاتی ہے۔ اسی طرح اُن کا احساسِ عدل و انصاف بھی زیادہ تر مجرموں کے حقوق کی حفاظت ہی کے لیے بے چین ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ اسے معاشرے کے حقوق اور جرائم کا شکار ہونے والے افراد کے حقوق کی کوئی فکر ہو۔

ہم یہاں اُس صورتِ حال کو مثال کے طور پر لیتے ہیں جو اس رویّے نے امریکہ میں پیدا کی ہے۔ ابھی چند مہینے پہلے جنوری ۱۹۶۷ء کے ریڈرز ڈائجسٹ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "ہمارے ہاں غیر مجرموں کے لیے بھی کچھ انصاف ہونا چاہیے"۔ ذیل میں ہم اس کا ایک مختصر سا خلاصہ درج کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ جرائم اور مجرموں کے متعلق اب مغربی عدل و انصاف کے رجحانات کس طرف جا رہے ہیں اور ان کے نتائج کیا ہیں:

پچھلے ۹ سال میں امریکی سپریم کورٹ سے مسلسل ایسے فیصلے صادر ہوتے ہیں جن کی تعبیر قانون رفتہ رفتہ پولیس کے ہاتھ باندھتی چلی گئی ہے اور مقدمات کی سماعت کرنے والے جج اور جیوری انصاف کے معاملہ میں مفلوج ہوتے چلے گئے ہیں، اور یہ سب کچھ مجرموں کے فائدے کے لیے ہے۔ اب پولیس پر یہ لازم کر دیا گیا ہے کہ جب کبھی وہ کسی جرم کے شبہ میں کسی شخص کو گرفتار کرے تو پوچھ گچھ کرنے سے پہلے اس کو خبردار کر دے کہ وہ خاموش رہنے اور کسی سوال کا جواب نہ دینے کا پورا حق رکھتا ہے۔ بلکہ اگر وہ کسی طرح یہ ظاہر کر دے کہ وہ پولیس کے سوالات کا جواب نہیں دینا چاہتا تو پولیس کو پوچھ گچھ بند کر دینی چاہیے۔ علاوہ بریں پولیس کا یہ فرض بھی ہے کہ مشتبہ شخص کو دورانِ تفتیش

میں ایک وکیل فراہم کرکے دے اور اگر اس کی یہ خواہش ہو کہ پوچھ گچھ کے وقت اس کا وکیل موجود رہے تو لازماً اس کی اجازت دینی ہوگی۔ ان فیصلوں میں ملزموں کے اعترافِ جرم کو قریب قریب بے معنی بنا کر رکھ دیا گیا ہے، حتیٰ کہ جہاں اس کے صحیح ہونے کے تمام قرائن اور شواہد موجود ہوں، وہاں بھی کسی خفیف سے خفیف قانونی سقم کی بنا پر اسے اٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے۔ خواہ اس امر میں کوئی شبہ باقی نہ رہا ہو کہ ملزم نے واقعی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

واشنگٹن ڈی سی کی عدالت میں ۱۴ سال کا ایک شخص پیش ہوا جس نے اپنی بیوی کو قتل کرکے کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا تھا۔ تین مختلف اوقات میں وہ خود اقرار کر چکا تھا کہ قتل کا ارتکاب اسی نے کیا ہے۔ پولیس کو وہ خود جائے واردات پر لے گیا تھا۔ اس کے باوجود اسے چھوڑ دیا گیا کیونکہ سپریم کورٹ کے فیصلوں کی وجہ سے اعترافِ جرم کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی ہے۔

ایک خاندان نے اپنے گھر میں رنگ روغن کرانے کے لیے ایک رنگ ساز لگا رکھا تھا۔ ایک روز وہ شراب پیے ہوئے اپنے کام پر گیا۔ گھر والوں نے اس حالت میں اس سے کام لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر ناراض ہو کر اس شخص نے رات کے وقت اس گھر پر آگ لگانے والا بم (مولوٹاف کاک ٹیل) پھینک دیا جس سے سارا گھر جل گیا، گھر والی جو اپنے تین بچوں کے ساتھ سوئی پڑی تھی بمشکل مرتے مرتے بچی، اور ۱۰ ہزار ڈالر کا مالی نقصان ہوا۔ پولیس کا ایک آدمی فوراً موقع پر پہنچ گیا جبکہ مجرم ابھی وہاں موجود تھا۔ ایک شخص نے اسے بتایا کہ یہ آدمی ہے جس نے آگ لگائی تھی۔ پولیس والے کے پوچھنے پر اس نے خود اقرار کیا کہ ہاں میں نے آگ لگائی تھی لیکن جب مقدمہ چلا تو عدالت نے اس کے اعترافِ جرم کو صرف اس بنیاد پر خارج از بحث قرار دے دیا کہ پولیس کے ایک باوردی سپاہی کی موجودگی بجائے خود ملزم کو ذہنی حیثیت سے اس قدر خوف زدہ کر دینے کے لیے کافی تھی کہ اس نے مجبوراً اپنے آپ کو خود مجرم ٹھیرا دیا، اور اس طرح اُس کا وہ حق مارا گیا جو امریکی دستور نے اسے دیا ہے کہ کسی شخص کو اپنے خلاف شہادت دینے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔

کلیولینڈ میں ایک نوجوان نے ایک دوسرے نوجوان کو قتل کرنے کا اقرار کیا، مگر عدالت

نے اس بنا پر اسے چھوڑ دیا کہ تفتیش سے پہلے پولیس نے اسے اُس کے حقوق سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ جج نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ مجھے اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ قاتل یہی شخص ہے اور اس نے جان بوجھ کر بالارادہ کسی معقول وجہ کے بغیر مقتول کی جان لی ہے، لیکن سپریم کورٹ کے اُن فیصلوں نے میرے ہاتھ باندھ دیئے ہیں جو معاشرے کے حقوق پر افراد کے حقوق کو ترجیح دیتے ہیں۔

واشنگٹن ڈی سی میں ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کیا۔ وہ خود اپنے اس جرم کا اعتراف کر چکا تھا، مگر عدالت نے اس وجہ سے اس کو بری کر دیا کہ ملزم کو تھانے لے جا کر پوچھ گچھ کرنے میں پولیس نے اتنا وقت صرف کر دیا تھا کہ میجسٹریٹ کے سامنے اسے پیش کرنے میں ناروا تاخیر ہو گئی۔ یہ ۱۹۵۷ء کا مقدمہ تھا جس میں ½ ۱ گھنٹے کی تاخیر کو ناروا ٹھیرایا گیا تھا۔ ۱۹۶۲ء کے ایک مقدمہ میں تین گھنٹے کی، ۱۹۶۴ء کے ایک اور مقدمہ میں آدھ گھنٹے کی اور ۱۹۶۵ء کے ایک مقدمہ میں پانچ منٹ کی تاخیر غیر معقول قرار دی گئی۔ گویا بحث اِس سے نہیں کہ مجرمین کے جرائم کتنے گھناؤنے ہیں، اور وہ بجائے خود ثابت ہیں یا نہیں، بلکہ اصل مدارِ بحث یہ ہے کہ اُن کے قانونی حقوق کا، جو روز بروز لطیف سے لطیف تر ہوتے جا رہے ہیں، پُورا پُورا تحفظ کیا گیا ہے یا نہیں۔ اگر ان حقوق کا لحاظ کرنے میں کوئی خفیف سے خفیف اصطلاحی خامی بھی رہ گئی ہو تو وہ مجرم کو چھوڑ دینے کے لیے کافی ہے اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ عدالت سے بری ہونے کے بعد پہلی فرصت ہی میں وہ پھر کسی کی جان، مال یا آبرو پر دست درازی کر بیٹھے۔

مجرمین کے ساتھ ان رعایتوں کا حاصل یہ ہوا ہے کہ فلیڈلفیا میں اب پولیس جن لوگوں کو جرائم کے شبہ میں گرفتار کرتی ہے ان میں سے ۵۶ فی صدی ہر سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ بروکلین میں پہلے جتنے لوگ پولیس کی پوچھ گچھ کا جواب دینے سے انکار کرتے تھے اب ان سے چار گنے یہ طریقہ اختیار کر رہے ہیں۔ قریب قریب یہی حال امریکہ کے بیشتر شہروں کا ہے جس کی وجہ سے بکثرت جرائم کی وارداتوں کا سراغ لگانا ناممکن ہو گیا ہے ——— یہ ہے جُرم اور مجرمین کے معاملہ میں مغربی قانون اور انصاف کا رویّہ۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی قانونِ تعزیرات پر ان لوگوں کے اعتراض کو آخر ہم کیا وزن دیں اور کیوں دیں؟